بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اِن سطور کے لکھنے کا آغاز ۲۳ مارچ کے مبارک دن کو کیا۔

۲۳ مارچ کو ہماری زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہی تاریخ تھی جب ۱۹۴۰ء میں بہ مقام لاہور قرارداد پاکستان منظور کی گئی، پھر اسی تاریخ کو پاکستان کا پہلا دستور (۱۹۵۶ء) نافذ ہوا۔ اور اب یہی تاریخ ہے جب پورے اٹھائیس برس (سکندر مرزا کا مختصر دور، ایوبی مارشل لا یحییٰ خان کا مارشل لا، بھٹو کے زمانے کا "عوامی مارشل لا" اور اذیت ناک "جمہوری آمریت") کے بعد بحالیٔ جمہوریت کی اسکیم کا نہایت اہم مرحلہ طے ہوا، یعنی قومی اسمبلی اور سینیٹ کا مشترکہ اجلاس منعقد ہوا۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ء سے اسلام کے اُبھار اور غلبے کے ساتھ پاکستان کے استحکام و ترقی کا نیا دور شروع کرے، وہ صدر مملکت، وزیراعظم، کابینہ، سپیکر، ڈپٹی سپیکر، سینیٹ کے صدر، جملہ نمائندگانِ جمہور اور علماء و عوام کو خواتین سمیت اپنے فرائض خدا و رسولؐ کی تعلیمات کے مطابق دیانت و عدل اور خلوص و بے لوثی کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق دے۔ اللہ تعالیٰ یہ رحم بھی فرمائے کہ موجودہ بحرانی حالات میں گھرے ہوئے پاکستان کی پارلیمانی فضا ہر قسم کے ناروا جوڑ توڑ، عالمِ بالا کی سازشوں، مفاد پرستیوں اور افراد، پارٹیوں، خاندانوں، علاقوں اور بیوروکریسی کی تخریبی کشاکشوں، نیز پسِ پردہ ہر قسم کی غیر ملکی دخل اندازیوں سے محفوظ و مامون رہے۔ نمائندہ حکومت اور نمائندہ ایوان دونوں مل کر اختلافات واقع ہونے کے باوجود اتحاد و اعتماد کی فضا میں کام کریں اور پاکستان کے شہری بھی وحدت و اخوت کی

بنیانِ مرصوص ثابت ہوں۔

انتخابات ۱۹۵۵ء میں تحریکِ اسلامی کے علمبرداروں نے کیا پارٹ کیا اور جواب میں تحریک اسلامی کو کیا ملا، اس پر اجمالی اظہارِ حقائق سے قبل ایک تمہیدی گذارش ضروری ہے۔

ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دورِ ماسبق کی ملوکی ریاستوں یا باقاعدہ سیاسی نظام کے بغیر چلنے والے قبائلی معاشروں کے بالمقابل آج کے سیاسی طور پر منظم معاشروں اور اچھی طرح تسلط یافتہ حکومتوں میں بڑا فرق ہے۔ آج کے حالات میں کسی نظریہ و عقیدہ کے تحت تبدیلی لانے والوں کو اگر جمہوری نظام میں کام کرنے کا موقع ملے تو انتخابات تبدیلی لانے کا ذریعہ بھی ہو سکتے ہیں اور اس میں معاون بھی ہو سکتے ہیں۔ انتخابات عوام اور ووٹروں کے حلقوں میں بھی اور پارلیمانی دائرے میں بھی مختلف نظریات و مقاصد کے لیے اچھا میدانِ دعوت بھی اور حرکت افزا میدانِ کشمکش بھی فراہم کرتے ہیں۔ انتخابات اہلِ دعوت کے لیے شہریوں سے بالمشافہ ربط پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ بھی ہیں۔

اسلامی دعوت کے علمبرداروں کو انتخابی میدان میں یہ موقع ملتا ہے کہ وہ ملک کی آبادی کو یہ تعلیم دے سکیں کہ اسلام کا سیاسی نظام کیا ہے؟ ایک مسلم معاشرہ میں کیسی حکومت ہونی چاہیے؟ اہم دینی اور ملکی مسائل کیا ہیں؟ قیادت کا صحیح معیار کیا ہے؟ اور ووٹر کی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں؟ یہ درست کہ انتخابات کے پُر ہنگامہ دور میں یہ دعوت مجمل اور سرسری ہوتی ہے، مگر غیر مؤثر ہرگز نہیں۔ پچھلے انتخابی تجربوں کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو ایسے ووٹروں کا عددی تناسب تواتر سے بڑھ رہا ہے جن کے ذہن اسلامی اصول و معیارات سے متاثر ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے سے دعوت و اشاعتِ دین کا جو گہرا اور وسیع کام ہوتا رہتا ہے — مثلاً دروسِ قرآن، اجتماعات، جلسہ ہائے عام، بیانات، پوسٹر اور ہینڈ بل اور ذاتی رابطے اور گفتگوئیں — ان سب کا اثر موجود ہوتا ہے، مگر اس طرح کے پھیلے ہوئے اثرات کو سمیٹ کر واضح اور متعین صورت میں سامنے لانے کا موقع انتخابات ہی میں ملتا ہے۔ اور خود انتخابی کام ان اثرات کو گہرا کرنے اور آگے بڑھانے میں بہت اثر ڈالتا ہے۔

ہمارا اب تک کا تجربہ یہ ہے کہ انتخابی ماحول میں کسی خاص صورتِ حالات کے تحت

ذہنوں پر اثر انداز ہونے والے سیاسی و اقتصادی اور تہذیبی و اخلاقی مسائل کے حوالے سے دینی اصول و اقدار کے لیے نتیجہ خیز کام کیا جا سکتا ہے۔ ایسا کام مجرد علمی مقالوں یا وعظوں سے سرانجام نہیں پا سکتا ــــ اگرچہ یہ چیزیں دعوت کی مجموعی اسکیم میں اپنی جگہ ضروری ہیں۔ علاوہ ازیں متاثر ہونے والے عوام کو ان کی جگہ پر جامد چھوڑ دینے کے بجائے، چونکہ انہیں اپنے ساتھ کشمکش میں شریک کر لیا جاتا ہے، اس لیے نہ صرف یہ کہ وہ ایک متعین حلقے سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ بلکہ آگے کے لمبے مجاہدے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اقامتِ دین کے لیے کام کرنے والے صحیح شہدائے حق اگر انتخابی میدان میں موجود ہوں تو وہ آہستہ آہستہ عوام کی ایسی تربیت کر سکتے ہیں کہ وہ برادری علاقے، طبقے، قریب کے چھوٹے چھوٹے مسائل اور ذاتی و گروہی مفاد پرستی کو چھوڑ کر اسلامی نظریہ قیادت کو قبول کر لیں[1]

اس ساری مہم کو چلانے کے لیے بس ایک ایسے منظم گروہ کی ضرورت ہوتی ہے جس کے

---

[1] انتخابی طریق کار کے متعلق ہمارا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ مطلوبہ انقلاب اپنی مکمل صورت میں لازماً پارلیمانی طریقے سے نمودار ہو سکتا ہے، بلکہ ہم بخوشی کسی معترض کے کہنے سے پہلے اعتراف کرتے ہیں کہ صدارتی یا پارلیمانی کسی بھی جمہوری نظام اور اس کے تحت ہونے والے انتخابات میں مخالف تخریبی رجحانات کا بہت دخل ہوتا ہے۔ اور ٹکراؤ کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ پس یہ دعوے نہیں کیا جا سکتا کہ مجرد انتخابی عمل اور پارلیمانی نظام میں حصہ لینے کے نتیجے میں گوہر مقصود حاصل ہو سکتا ہے ہماری رائے صرف یہ ہے کہ اس راستے سے دعوتِ اقامتِ دین کو پھیلانے اور اسلامی انقلاب کے لیے فضا کو سازگار کرنے کے لیے واضح مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ فضا جب اچھی طرح سازگار ہو جاتی ہے تو پھر رائے عام کے دباؤ سے آگے بڑھنے والا انقلابی عمل کا ریلا وقتی رکاوٹوں کو توڑ کر اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے۔ بڑی سے بڑی جمہوریت پسند تحریک کو بھی دوڑ لگاتے ہوئے کسی آخری مرحلے پہ بند پھاٹک کو عبور کرنے کے لیے کوئی بڑی جست لگانی پڑ سکتی ہے۔ اس مرحلے کے متعلق سوچنا آج ہمارا کام نہیں، ہم تو جمہوری و آئینی راستے ہی سے آگے بڑھیں گے۔ ہمارا ابتدائی کام جب تکمیل کو پہنچے گا تو اس وقت وہ کام اپنا راستہ خود ہو گا۔

تمام افراد ایمان اور عمل صالح سے آراستہ ہوں اور اپنے موقف پر استقامت سے قائم رہیں

متذکرہ تمہیدی بات کے بعد اب ذرا دوسرا پہلو!

اس معاملے میں ہمارا کوئی جھگڑا نہیں، اُن مخلص افراد یا گروہوں سے، جن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اصل چیز افراد کی اصلاح ہے، رہا اسلامی نظام کا قیام، سو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ انعام ہوتا ہے۔ اسی نظریے کی دوسری شکل یہ بھی ہے کہ پہلے معاشرہ نیا ہو لے، پھر اسلامی نظامِ اجتماعی کے قیام اور اس سے متعلقہ سرگرمیوں سے دلچسپی لینے کا وقت آسکتا ہے۔ بغیر کسی منافرت و تصادم کے، ہماری رائے یہ ہے کہ زندگی کے چلتے ہوئے کاموں سے منقطع رہ کر ان کاموں کی اصلاح نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً یہ سوچنا کہ اس وقت تک کاروبار شروع نہیں کیا جا سکتا جب تک پوری مارکیٹ بدعنوانیوں سے پاک نہیں ہو جاتی۔ آخر لوگوں کے کاروبار کو قریب سے جاننے سمجھنے اور ان کے مسائل کا براہِ راست تجربہ و مشاہدہ کیے بغیر ان کی صحیح رہنمائی کرنا اور اصلاح کے خطوط ان کے سامنے واضح کرنا کیسے ممکن ہے۔ اللہ کا جو بھی نیک بندہ کاروبارِ دنیا سے کٹ کر کلمہ، نماز، ورد، وظیفہ، بیعت، وعظ، افتاء اور درس کے اچھے اچھے مشغلوں میں مصروف رہتا ہے، کیا وہ اپنے کام پر اتنا اعتماد رکھتا ہے کہ طلبِ دولت اور حُبِ منافعِ کثیر کی مسابقت کے شدید دباؤ میں آئے ہوئے بے شمار کاروباریوں کو ان کی کشمکش میں وہ اتنی مؤثر مدد دے سکے گا کہ وہ لوگ بدعنوانیوں کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں اور اس نیک جہاد میں وہ ہر نقصان خوشی سے برداشت کر لیں۔ عموماً یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ بیعتیں بھی ہوتی ہیں، ذکر اذکار بھی چلتے ہیں، تہجد بھی پڑھے جاتے ہیں، تبلیغی دَورے بھی جاری رہتے ہیں، مگر کاروبار کو اسمگلنگ[1]، سود، سٹے، ذخیرہ گردی، چور بازاری، بیجا نفع اندوزی، ملاوٹ، مغالطہ دہی، غلط ناپ تول[2]، وعدہ خلافی، حصہ داروں کی باہمی خیانت، بعض متعلقہ

---

[1] اب تو اسمگلنگ کا انداز یہ ہے کہ غیر ملکی اشیاء سرکاری ڈیوٹیوں کی ادائیگی کے بغیر کھلے بندوں شہر بہ شہر فروخت ہوتی ہیں۔

[2] غلط ناپ تول کی بیسیوں شکلوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کاغذ کے (باقی برصفحہ آئندہ)

سرکاری کارندوں کو رشوت دہی، جعلی حساب کی تیاری، انڈرانوائسنگ، پاکستان اور ہانگ کانگ اور سنگاپور کی بنی ہوئی چیزوں پر ساختۂ جاپان کی مُہر کی چھاپ ـــــ غرضیکہ خرابیوں کا ایک ایسا طوفان ہے کہ لوگ غوطے کھاتے ہوئے اس میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔ کنارے سے اس طوفان میں غوطے کھانے والوں کی ہلا شیری کرنے والے نیک آدمی کو سوچنا چاہیے کہ کیا اس کی کوششیں اُس صورت میں زیادہ نتیجہ خیز نہ ہوتیں جب کہ وہ خود بھی طوفان کے اندر اس کی موجوں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے دھارے کے خلاف پیرنے کا جہاد کر رہا ہوتا اور دوسرے طوفان زدگان کو بھی اپنے استدلال اور اپنی مثال سے اس کی دعوت دے رہا ہوتا۔

معاشرے کے اندر لادینیت، بدعنوانی، مفاد پرستی اور بے حیائی کے طوفان کا زور مسلسل بڑھ رہا ہے اور طوفان کی موجیں اس کا انتظار کرنے کے لیے رُکی نہیں رہتیں کہ پہلے آپ کروڑ دو کروڑ افراد کو اس طوفان سے کہیں باہر رکھ کر اچھی طرح تیار کر لیں۔ اور ایک مختلف فکر و اخلاق کا مضبوط معاشرہ منظم کر لیں۔ آخر شیطانی قوتیں اس عرصے میں کام سے مستعفی یا معطل ہو کر تو نہیں بیٹھیں گی! وقت جتنا گذرتا جائے گا، کام اتنا ہی مشکل ہوتا جائے گا۔

سو ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ زراعت کا رزراعت کرتے ہوئے، معلّم تعلیم دیتے ہوئے، کلرک ملازمت کرتے ہوئے، سیاست کار سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھتے ہوئے اور "نیک آدمی" انتخابات میں حصہ لیتے ہوئے اپنی دینداری، اپنے اخلاق اور اپنے اسلامی نظریۂ حلال و حرام کے مطابق مخالف عوامل سے لڑنے کی کوشش کرے، اسی میں اس کے ایمان کا امتحان ہے، اسی طریقہ سے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اصلاح کی رفتار تیز ہو سکتی ہے، اسی صورت میں ہر نوع کے مفید کارکن تحریکِ اقامتِ دین کو مل سکتے ہیں۔ اور اسی مجاہدانہ عمل کے تسلسل کے نتیجے میں وہ حالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ اسلامی نظام پورے کا پورا عملاً برپا

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) رِم خریدیے تو کاغذ بلحاظ تعداد کم نہیں گے اور کسی رِم کا وزن پورا نہیں ہوگا۔ نیز ایک ہی رِم کے تختوں میں دبازت اور رنگت میں فرق ہوگا۔ (یہ چیز ملاوٹ کی تعریف میں داخل ہے)۔

ہو سکے۔

ہماری تمہیدی گذارش جو ایک طویل جملہ معترضہ بن گئی، یہاں ختم ہوتی ہے۔

انتخابات ۸۵ء کے متعلق سب سے پہلی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے سیٹوں کی گنتی کو الگ رکھ کر اس حقیقت پر نگاہ جمایئے کہ اب تک جو سیاسی عمل جمہوری ایوانوں کے قیام تک ہمیں لے آیا ہے اس میں ہمارا کیا حصہ ہے — اور ہماری پالیسی اور مرحلہ بہ مرحلہ ہمارے فیصلے اپنے آخری نتائج کے لحاظ سے کس حد تک کامیاب ثابت ہوئے۔

دونوں مرکزی ایوانوں کے مشترکہ اجلاس اور بعد ازاں وزیراعظم کے تقرر پر مرکزی اسمبلی کی طرف سے بالاتفاق اظہار اعتماد کے پُرمسرت لمحات کا پُرسکون طریق سے ظہور مستقبل کے لیے مبارک علامات ہیں اور اس سارے سفرِ جمہوریت میں کچھ ہمارا حصہ بھی شامل ہے۔

ملک و قوم کے لیے ہماری طویل المیعاد خدمت یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ پر اور اپنے حلقۂ اثر پر مضبوطی سے قابو رکھ کر برسوں کی جمع شدہ قوت کو مارشل لا کے ساتھ تصادم کرنے سے روکے رکھا۔ اگر یہ قابو نہ رکھا جا سکتا تو فوجی اقتدار سے تصادم کے نتیجے میں یا تو جاری مارشل لا طوالت پکڑتا اور زیادہ سخت گیر ہو جاتا۔ یا اس کے اندر سے ایک اور تازہ دم مارشل لا نکل آتا — نیا مارشل لا قانونِ ضرورت کے تحت لاقانونیت کا ڈنڈا تھام کر سارا سبق از سرِنو الف با سے شروع کرتا اور زیادہ اندیشہ یہی ہو سکتا تھا کہ نئے مارشل لا کا رُخ بھی بالکل دوسری جانب ہوتا اور اس کا طرزِ معاملہ بھی مختلف ہوتا۔ بیچ میں ہم اس قوت کو جو خدا کی طرف سے ایک امانت تھی، مفت میں پسوا لیتے۔ جس کے نتیجے میں وہ برسوں تک ماسوا تقدیر کا ماتم کرنے کے، کوئی مفید خدمت انجام دینے کے قابل نہ ہوتی۔

یہ باتیں محض خوف انگیز وساوس پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ عالمِ اسلام کے مختلف خطوں میں قریب کی تاریخ نے جو سبق ہمارے سامنے پھیلا دیئے ہیں اُن کے حقیقت پسندانہ مطالعہ پر مبنی ہیں — ان اسباق کا خلاصہ یہ ہے کہ فوجی حکومتوں سے لڑ بھڑ کر حصولِ مراد ممکن نہیں، ان سے عدمِ تصادم

کا رویہ اختیار کر کے نسبتہً بہتر نتیجے تک پہنچا جا سکتا ہے خواہ رفتارِ پیش قدمی کم ہی کیوں نہ رہے۔ اسی کے ساتھ ہماری نگاہ ان خطرات تک بھی تھی جو دو طرفہ سرحدوں سے اس طرح جھانک رہے تھے (اور ہیں!) جس طرح کسی جھاڑی کے پیچھے سے کوئی ریچھ یا چیتا جھانکتا ہے۔

اصل میں چھاپہ مار طریقوں کو الگ رکھ کر پابند آئین و اخلاق تحریکوں یا کم سے کم باقاعدہ منظم سیاسی جماعتوں کے لیے ماسوا جمہوری جدوجہد کے اور کوئی راستہ ہی نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ مارشل لا کے تحت جب اسمبلیاں باقی نہ ہوں، سیاسی تنظیموں کو کالعدم کر دیا جا چکا ہو؟ پلیٹ فارم موجود نہ ہو، جلسوں کا انعقاد اور جلوسوں کا مارچ کرنا ممنوع ہو، پریس آزاد نہ ہو حتیٰ کہ عدلیہ تک کو ایسا مقام حاصل نہ رہے کہ وہ کسی معاملے میں حکمران قوت کی مرضی کے خلاف فیصلہ دے سکے تو پھر کسی مؤثر تصادمی جدوجہد کا نقشہ بنا کر اُٹھ کھڑے ہونے کی جرأت کوئی ذی شعور تحریک یا جماعت تو نہیں کر سکتی۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی تنہا آدمی کسی مست ہاتھی سے ٹکر لینے کے لیے نکل کھڑا ہو۔

لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ مرحلہ بہ مرحلہ پیش آنے والے واقعات نے کیسا کیسا دباؤ ہم پر ڈالا کہ ہم اپنے موقف کو بدل لیں۔ باہر سے بھی اور اندر سے بھی ہمیں کہا جاتا تھا کہ فلاں فلاں وجوہ سے ایک غلط کار قرار پانے والی حکومت کی سخت مخالفت کرنا شرعاً بھی اور اپنے نظریات و روایات کے لحاظ سے بھی اشد ضروری ہے۔ اِسی طرح باہر سے بھی اور اندر سے بھی ہمیں یہ احساس دلایا جاتا کہ جماعتِ اسلامی حکومت سے تعاون کر رہی ہے اور اس کی بی ٹیم کی حیثیت میں ہے[1]۔ اِس وجہ سے بعد میں خراب نتائج بھگتنے ہوں گے۔ چنانچہ اکا دکا آوازیں اب بھی

---

[1] کاش کہ ان اوراق میں اتنی گنجائش ہوتی کہ قائد تحریک کے وہ خطوط اور بیانات اور ان کے مشیروں کی وہ قراردادیں یہاں پیش کی جا سکتیں، جن میں حکومت اور اس کے نظریات اور اس کی کارروائیوں نیز اس کی کوتاہ کاریوں اور غلط کارروائیوں میں اتنی سخت اور واشگاف تنقید کی گئی ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے فرد یا گروہ نے کی ہوگی۔ نیز بار بار یہ واضح کیا جاتا رہا کہ ہم اچھے فیصلوں یا اقدامات کو اچھا بھی کہیں گے اور غلط فیصلوں اور کاموں کی غلطیوں پر گرفت بھی کریں گے۔

ایسی سُنائی دیتی ہیں کہ جماعت کو حسبِ دل خواہ سیٹیں اس لیے نہیں مل سکیں کہ اس کو حکومت کا حامی سمجھا جاتا تھا۔ اور کوئی مخصوص صورت ایسی اختیار نہیں کی گئی کہ لوگوں کا یہ تاثر ختم ہو جاتا۔ گذشتہ دورِ آزمائش میں ایک رجحان یہ بھی چلتا رہا کہ حمایتِ حکومت کے الزام کو رفع کرنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ مارشل لا حکومت کے خلاف منافرت انگیزی کے کچھ نہ کچھ فسادی انداز اختیار کیے جائیں۔

بہرحال ہم نے اپنی پالیسی جس ہدفِ مقصود کو سامنے رکھ کر بنائی اور رائے مباحثہ نہایت مشکلوں سے نبھائی وہ یہ تھا کہ کسی طرح مارشل لا سے پُرامن طور پر اقتدار منتخب جمہوری ایوانوں کی طرف منتقل ہو جائے اور بیچ میں وہ طاقتیں کوئی خلل نہ پیدا کر سکیں جنہوں نے دو مختلف مرحلوں پر تخریبی کارروائیوں اور محاذ آرائی کے طریقے اختیار کر کے یہ چاہا تھا کہ انتقالِ اقتدار کا مرحلہ پُرامن طور پر طے نہ ہو سکے بلکہ بحرانی حالات پیدا کر کے مارشل لا کا صرف چہرہ بدلوا کر اسی کے ذریعہ قوم کو خود ہانکا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسے منفی رجحانات کو مکمل طور پر شکست ہوئی۔

پھر وہ ایک نازک موڑ تھا جب کہ ریفرنڈم کے متعلق رائے قائم کرنے کی ذمہ داری ہمارے سر عاید ہوئی۔ ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم نے اس وقت اس معنی میں صحیح فیصلہ کیا کہ درِ جمہوریت کھلنے کی کلید قوم کو مل سکے[1] اس وقت کی فضا ہماری نگاہ میں ہے کہ نہ صرف

---

[1] بعض سیاسی دانشور جو پہلے ریفرنڈم کی مخالفت کرتے رہے تھے اور بعد میں ریفرنڈم کو ایک ڈھونگ ثابت کرنے میں مصروف تھے (اور اب تک یہ مشغلہ جاری ہے)۔ ہمارے اس نقطۂ نظر کو سمجھ نہ سکے کہ ریفرنڈم اصل مقصود تھا ہی نہیں، مطلوب تو انتخابات کا انعقاد اور اسمبلیوں کا قیام (اتنا کچھ عملاً ہو چکا ہے) اور مارشل لا کا خاتمہ تھا (جو فی الوقت باقی ہے)۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے انڈے کے وجود میں اصل قدروقیمت چھلکے کی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس شے کی ہوتی ہے جو چھلکے کے اندر محفوظ ہوتی ہے۔ اصل شے کے حصول کے بعد چھلکا ٹوٹ پھوٹ کر کوڑے کا حصہ بن جاتا ہے۔ اب جو حضرات ریفرنڈم ہی کے قضیے میں اُلجھے ہوئے ہیں (باقی بر صفحہ آئندہ)

اخباری حلقوں بلکہ سیاست سے تعلق رکھنے والے بعض مذہبی حلقوں میں بھی محسوس کیا گیا کہ جماعتِ اسلامی بازی لے گئی۔ ہمارا فیصلہ وہ واحد فیصلہ تھا جس پر حکومت کی نگاہیں بھی مرتکز تھیں اور عوام کی توجہات بھی منعطف تھیں۔ کسی کے لیے یہ پیش قیاسی کرنا ممکن نہ تھا کہ کیا فیصلہ ہونے والا ہے اور جب فیصلہ ہو گیا تو جیسے تبدیلی کی ساری مہم میں جان پڑ گئی۔ اس وقت اگر ہم مخالفت کر کے تبدیلی کے امکانات کی فضا کو خراب کرنے والوں کے ساتھ شریک ہو جاتے تو ہو سکتا ہے کہ حالات کا دھارا کسی اور طرف بہہ نکلتا۔ خود ہم نہ اِدھر کے رہتے نہ اُدھر کے۔ نہ حکومت کے ساتھ چلنے والے عناصر ہمارے قریب آ سکتے اور نہ ہم مخالف عناصر کا ساتھ دے سکتے۔ اِس فیصلے کے بعد انتقالِ اقتدار کے مجوزہ عمل کی مخالفت کرنے والے لوگ جامد اور غیر مؤثر بائیکاٹ سے زیادہ کچھ نہ کر سکے۔

پھر مختلف حلقوں کی طرف سے اُٹھائے جانے والے ہزار قسم کے شکوک و شبہات اور اندیشوں کے باوجود ہم نے انتخابات میں حصہ لے کر عوام میں اس رَو کو تیز تر کیا کہ انتخابات جیسے بھی ہو رہے ہیں اور دستوری نظام کی جو بھی شکل بنتی نظر آتی ہے، اس کے باوجود آگے بڑھا جائے، کیوں کہ عوامی نمائندوں سے تشکیل پانے والے ایوانوں میں اتنی قوت ہو گی کہ وہ نقشۂ احوال کو بدل سکیں۔ یہ فیصلہ عوامی رجحانات کے ساتھ اتنا ہم آہنگ تھا کہ اُمیدواروں کی بھی قطاریں لگ گئیں اور ووٹر بھی ہجوم در ہجوم نکل کھڑے ہوئے بلکہ بات یوں "تیری جوانی" تک پہنچی کہ بائیکاٹ کرنے والی پارٹیوں کے نمایاں اور غیر نمایاں اصحاب بھی کثیر تعداد میں ضبط و نظم کی زنجیریں توڑ کر انتخابات کے سیاسی رقص میں اِس طرح شامل ہو گئے جیسے مولانا روم کی حکایت کا دیہاتی اپنا گدھا گُم کر کے نادانی کے عالم میں اس بول پر ناچ رہا تھا کہ "خر برفت و خر برفت و خر برفت"۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ان کی توجہ اس طرف نہیں گئی کہ اب جبکہ جمہوری ایوان قائم ہو چکے ہیں، ریفرنڈم کا موضوع ہی ختم ہو چکا ہے۔ اصل مطلوب تو تھا ہی جمہوری ایوانوں کا قیام، تاکہ وہ مارشل لا کو حسن و خوبی سے رخصت کر سکیں۔

اور اس رحمتِ ربی پر ہمیں بہت مسرت ہے کہ بغیر اس کے کہ انتخابات میں کوئی تخریبی کارروائی ہو سکی ہو، اور بغیر اس کے کہ عوام میں بائیکاٹ کا واضح رجحان پیدا کیا جا سکا ہو، اور بغیر اس کے کہ صدر کی حلف برداری، وزیراعظم کے تقرر اور اس پر اظہارِ اعتماد کے مرحلوں میں کوئی بحران انگیز لہر ابھر سکی ہو، آج جمہوریت کی گاڑی آغازِ سفر کر چکی ہے[1]۔

لوگوں کے یہ اندیشہ ہائے دور و دراز بھی غلط ثابت ہوئے کہ حکومت لسٹ بنا کر اپنی پسند کے افراد کو کامیاب کرائے گی اور جو امیدوار خارج از فہرست ہوں گے ان کو ناکام کرا دے گی - یعنی سب کچھ ایک ڈرامہ ہوگا - حکومت کے پسندیدہ وزراء اور فوجی افسران کی اچھی خاصی تعداد شکست کھا گئی - بعض ایسے ایسے امیدوار کامیاب ہوئے کہ جن کا انتخابی مہم کے دوران میں بھی کسی کو امکان نظر نہ آتا تھا — دولت ضرور استعمال ہوئی — بدعنوانیاں بھی ہوئیں، مگر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انتخابی عمل کی ڈور کا سرا حکومت کے ہاتھ میں تھا -

آج ہم اپنی ٹھنڈی پالیسی اور اپنے متوازن فیصلوں پر اس لیے خوشی محسوس کر رہے ہیں کہ ہم نے صدقِ دل سے جس صورت کو ملک کی مفید خدمت سمجھا تھا وہ عمل میں آ گئی - سچی بات یہ ہے کہ اگر ہمیں ایک بھی سیٹ نہ ملی ہوتی تو بھی وسیع معنوں میں ہمیں اللہ تعالیٰ نے جو کامیابی عطا فرمائی ہے اس کے لیے ہم اس کے شکرگزار ہیں -

اب بڑا مرحلہ طے ہو جانے کے بعد جس خوشگوار رابطے سے صدارت و وزارت کے دور کا آغاز ہوا ہے، اس کے پیش نظر ہمیں یقین ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب کہ بنیادی حقوق قوم کو واپس مل جائیں گے، عدلیہ کا وقار و اختیار پوری طرح بحال ہو جائے گا - پریس پر سے ناروا پابندیاں ہٹ جائیں گی، سیاسی جماعتیں بحال ہو جائیں گی - اور مارشل لا اندیشوں کے

---

[1] ہمیں یہ اندازہ ہے کہ پس پردہ کچھ ایسی قوتیں دم سادھے موجود ہیں کہ حالات اگر ذرا بھی گنجائش دیں تو وہ اب تک کے قیمتی حاصلِ مساعی کو پل میں ملیامیٹ کر کے پاکستان کو تاریک گڑھے میں دھکیل سکتی ہیں - مگر امید ہے کہ خدا انہیں ایسی ہمت نہیں دے گا -

بخلاف جلد اُٹھا لیا جائے گا۔ صدر اور وزیر اعظم کے توازنِ اختیارات کا معاملہ بھی ترمیمات کے قیود سے نکل کر عملی تعبیر و روایت کے لحاظ سے زیادہ معتدل شکل میں سامنے آئے گا۔ اور اس معتدل شکل کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ ترامیم میں بھی ایوان ضروری ترامیم کر سکے گا۔ یہ چیزیں کسی بحرانی صورتِ حالات سے بچنے کے لیے ضروری ہیں اور موجودہ ملکی حالات میں بحران سے بچنے کا جذبہ ہی توازن پیدا کرنے کا باعث بنے گا۔

آیئے اب انتخابات ۱۹۸۵ء میں کالعدم جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھنے والے اصحاب کی حاصل کردہ سیٹوں کا جائزہ لیں۔ فی الحال سرسری معلومات پیش خدمت ہیں:۔

قومی اسمبلی میں حاصل کردہ نشستیں:
- ۱۔ صوبہ پنجاب سے = ۴
- ۲۔ صوبہ سرحد سے = ۴
- ۳۔ صوبہ سندھ سے = ۲
- ۴۔ صوبہ بلوچستان سے = ۱

میزان = ۱۱

سینیٹ میں:
- ۱۔ صوبہ پنجاب سے = ۱
- ۲۔ صوبہ سرحد سے = ۱
- ۳۔ صوبہ سندھ سے = ۱
- ۴۔ صوبہ بلوچستان سے = ۱

میزان = ۴

صوبائی اسمبلیوں کی نشستیں:
- ۱۔ صوبہ پنجاب سے = ۹
- ۲۔ صوبہ سرحد سے = ۶
- ۳۔ صوبہ سندھ سے = ۷
- ۴۔ بلوچستان سے = ۱[1]

میزان ۲۳ - ۱ = ۲۲

کل تعداد = ۳۷

---

[1] بلوچستان سے کالعدم جماعت اسلامی کے منتخب نمائندے مولینا عبدالحق نے بیک وقت قومی اور صوبائی سیٹیں جیتی تھیں۔ بعد میں انہوں نے صوبائی سیٹ چھوڑ دی اسے منہا کر دیا گیا ہے

یہ پہلا موقع ہے کہ مرکزی اور صوبائی تمام ایوانوں میں جماعت کے نمائندے موجود ہیں اور یہ پہلا موقع ہے کہ لاہور جیسے شہر سے ہمارے دوست کامیاب ہوئے ہیں۔

ذیل میں ہم جماعت کے حق میں پڑنے والے ووٹوں کے تدریجاً بڑھتے ہوئے تناسب کا خاکہ پیش کرتے ہیں:۔

۱۹۷۰ء ۔ جملہ ملکی ووٹ = ۱۹۳۷۱۸۳

جماعت کے حاصل کردہ ووٹ = ۹۴۵۲۷۵ حاصل کردہ ووٹوں کا تناسب = ۶٪

۱۹۸۵ء (ملک تقسیم ہونے کے بعد)

جماعت کے حاصل کردہ ووٹ = ۱۱۷۰۷۲۹ حاصل کردہ ووٹوں کا تناسب = ۱۲٪

اب صوبہ وار تفصیلی نقشہ ملاحظہ فرمائیے۔

	۱۹۷۰	۱۹۷۷	۱۹۸۵
صوبہ سرحد =	۱۰۳۹۳۵	۱۳۳۳۶۲	۱۹۷۲۱۱
صوبہ پنجاب =	۵۱۵۰۳۸	۷۹۲۵۳۵	۶۸۶۵۰۶
صوبہ سندھ =	۳۲۱۴۷۱	۲۹۳۹۶۷	۲۵۵۸۲۴
صوبہ بلوچستان =	۴۳۳۱	—	۳۱۱۸۸
میزان =	۹۴۵۲۷۵	۱۲۱۹۸۶۵	۱۱۷۰۷۲۹

اب جماعت کے ارتقا کو ایک اور پہلو سے دیکھیے۔ مختلف انتخابات میں حاصل شدہ سیٹیں یہ تھیں:۔

۱۹۵۱ء (پہلی بار) = قومی اسمبلی ۱ نمائندہ

۱۹۶۲ء = ۴ نمائندے (قومی اسمبلی میں مشرقی پاکستان سے)

۱۹۶۵ء = ۲ نمائندے (مغربی پاکستان کی اسمبلی میں)

۱۹۷۰ء = ۴ نمائندے قومی اسمبلی کے لیے مغربی پاکستان سے)

۱۹۷۷ء = ۹ نمائندے منتخب ہوئے (مگر انتخابات کالعدم قرار پائے)

۱۹۸۵ء = قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی جملہ ۳۷ نشستیں۔

اس قسم کے اعداد و شمار ہمارے لیے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ہماری قوت چونکہ برادریاں اور دولت یا جاگیریں نہیں ہیں، بلکہ اُصول و مقاصد ہیں، لہٰذا ہمارے لیے یہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ ہماری رفتارِ دعوت اور انتخابی ارتقاء دونوں متوازی طور پر چل رہے ہیں یا نہیں۔ ہمارے لیے یہ بڑی ہمت افزا بات ہے کہ ہماری انتخابی اور پارلیمانی قوت ہماری دعوت کے پھیلاؤ کے تناسب سے بڑھ رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنے بنیادی دعوتی کام کی رفتار سے مطمئن نہیں ہیں اور اس سلسلے میں ہمیں بڑے اور جامع پروگرام کے تحت نئی رفتار سے سرگرم عمل ہونا ہے۔

مخالفین میں سے بعض نے یہاں سے لے کر بی بی سی تک خوب شور مچایا کہ جماعت اسلامی مار کھا گئی۔ پروپیگنڈے میں وقتی طور پر بڑا زور ہوتا ہے۔ اس کے اثر سے بعض اپنوں کا ذہن بھی متاثر ہوا۔ یہ اپنے تئیں روایتی آدھے گلاس والے چکر میں پڑ گئے کہ صد افسوس، گلاس تو بھر نہیں سکا، حالانکہ دوسری طرف ہم لوگوں کا یہ اطمینان بخش نقطۂ نظر تھا کہ وہی گلاس جس میں پیندے کی چند بوندوں سے زیادہ کبھی کچھ نہ ہوتا تھا، الحمدللہ کہ آج آدھا بھر گیا ہے۔ مخالفین سے تو کیا تعرض، ہم اپنے افسوس کرنے والوں کے دلِ اندوہگیں کی حالت دیکھ کر افسوس کرتے ہیں۔

دراصل ہم ہی یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پارلیمنٹری دائرے میں ذمہ داری کا کتنا بھاری بوجھ ہمارے سر پر آ پڑا ہے۔ ہر اسمبلی میں اپنی ٹیم کو سنبھالنا، ان کی تربیت کرنا اور اس سطح کی قسم قسم کی مصروفیات کے لیے اُن کو تیار کرنا، اور ایوانوں سے باہر عوام میں اُن کو سرگرم عمل رکھنا، کارکنوں کی مدد ان کو بہم پہنچانا۔ اور انہیں اپنے اُصول و مقاصد، منشور اور نظم کی حدود میں رکھنا اتنا بھاری کام ہے کہ اس کے لیے ہماری بیرونی افرادی اور وسائلی قوت کی خاصی مقدار چاہیے۔

جمہوری و پارلیمانی کام کرنے والوں کے لیے تدریج ہی کا راستہ مناسب ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ پہلی ٹیمیں تیار ہوتی جاتی ہیں اور پیچھے سے نئی کمک پہنچتی رہتی ہے۔ عددیت سے زیادہ اہم پارلیمانی کام کا معیار ہوتا ہے۔ پارلیمانی امتحان میں اگر شاندار کامیابی حاصل نہ ہو تو سیٹوں کی عددیت کسی جماعت کو قوت و وقار نہیں دلوا سکتی۔

پس اپنی موجودہ قوتوں اور وسائل کے لحاظ سے ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ہمارے کندھوں پر ہماری بساط سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا ہے۔ دوسری طرف ایسی حالت میں بھی نہیں رکھا کہ ہم ایوانِ جمہوریت میں اپنے آپ کو بے وقعت محسوس کرتے۔ سبحٰن اللہ جلیل القدرِ عظیم الاحسان!

پھیلاؤ چاہنے والی تحریک کی حیثیت سے ہمیں ایک اور بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ہمارے کارکن جن کو تعطلِ سیاست اور شکستِ نظم کے بعد ایک غیر محسوس سا جمود چمٹ گیا تھا، وہ انتخابات کا بگل بجتے ہی جب میدان میں نکلے تو پھر انہوں نے عوام میں نفوذ کی مہم اس زور سے چلائی کہ اگلی پچھلی کسر نکال دی۔ یہ سپاہیانِ تحریک اپنی دوسری مصروفیات کو سمیٹ سکیڑ کر اور آرام کو تج کر گلی گلی میں گھوم گئے اور ایک ایک دروازے پر دستک دے کر اپنے ہر حلقۂ انتخاب میں چند دن کے اندر کئی کئی ہزار شہریوں سے ملاقاتیں بھی کیں اور مقصد کی باتیں بھی کیں۔ اس "گرداوری" کے جو نتائج سامنے آئے انہوں نے کارکنوں کے حوصلے بلند کر دیئے۔ ایک تو ان کے تجربے میں یہ بات آئی کہ زیادہ تر "انتخابی" لوگوں نے اُوپر اُوپر کے گٹھ جوڑ میں اپنے آپ کو مصروف رکھا، ذرا نیچے کوئی گیا بھی تو کسی مقامی یا محلہ دار لیڈر یا زمیندار چوہدری یا کارخانہ دار یا نمبردار یا غنڈہ ٹیم کے سربراہ سے معاملہ کر لیا۔ براہ راست ووٹروں تک اور خصوصاً شہروں کے غریب محنت کاروں، چھوٹے ملازموں اور خوانچہ فروشوں تک سوائے جماعت اسلامی کے کم ہی کسی کے کارکن پہنچے — اور کہیں کہیں جو پہنچے وہ بھی نہ کوئی خاص پیغام رکھتے تھے، نہ نظم، نہ کردار۔ ان کی تو بس ایک ہی پکار تھی کہ ہمیں ووٹ دو، لیکن کوئی روشن قسم کی دلیل ساتھ نہ تھی کہ ووٹ کیوں دو۔ نہایت حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ ان قریہ نوردیوں اور کوچہ گردیوں میں جہاں عام لوگوں کی طرف سے اعتراف کیا گیا کہ ہمارے پاس اس طرح کوئی نہیں آیا، وہاں بڑی تعداد ایسی نکلی کہ جو جماعت کو جاننے والی تھی اور اس کے لیے اچھا تاثر رکھتی تھی۔ ان میں سے خاصے لوگوں نے ووٹ دینے کے وعدے بھی

کیے اور ان کو پورا بھی کیا بلکہ کہیں کہیں تو کارکنوں کے ساتھ ہو کر کام میں لگ گئے۔ آپ ذرا جیتنے اور ہارنے والے تحریکی دوستوں کے ووٹوں کی تعداد دوں کو دیکھیے، وہ ہمارے جانے پہچانے کارکنوں کی تعداد سے بیسیوں گنا زیادہ ہیں۔ برادریوں اور گروہوں کے دباؤ، مخالفانہ پروپیگنڈے کے زور اور روپے کی طاقت کے سامنے اتنی مضبوطی سے کھڑے ہونے والے شہری اگر اس تناسب میں موجود ہیں تو پارلیمانی دائرے میں اسلام کا معرکہ مزید چند برس میں سر کر لے جانا کوئی مشکل نہیں۔

لیکن اس خوش آئند صورتِ حالات نے بہت بڑی ذمہ داری ہم پر ڈال دی ہے اور وہ یہ کہ جو رابطے ہم نے انتخابی مہم میں پیدا کئے ہیں ان کو برقرار رکھیں اور اچھے لوگوں کی جو تعداد سامنے آئی ہے اُسے سمیٹیں۔ اس غرض کے لیے قریہ نوردیوں اور کوچہ گردیوں کا جو سلسلہ ہمارے بنیادی طریقِ کار کا جزو تھا اور جسے ہم نے مدت بعد تازہ کیا ہے۔ اسے مسلسل آگے بڑھانے کی منصوبہ بندی کریں۔

ورنہ ہمارا حال اس کسان کا سا ہوگا جو جان مار کر لمبے چوڑے کھیت میں ہل چلائے، پھر بیج کا "چھٹا" دے۔ اور پھر بھول بھلا کر کئی برس تک اُدھر کا رُخ نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ زمین فصل دینے کے بجائے مُردہ ہو جائے گی۔ اپنے کاتے ہوئے سوت کے لچھے بنانے کے بجائے اسے جھیر جھیر کر دینا عقل و دانش کی راہ نہیں۔

اور مزید برآں ہمارے لیے ایک خوشگوار تبدیلی یہ ہے کہ "اسلام اسلام" کی جو پکار کئی سال سے جاری رہی ہے، پھر ریفرنڈم کے موقع پر پبلک نے جس شان سے تحریک پاکستان کے دَور کے جذبات کا اظہار کیا ہے اور پھر خود انتخابات ۸۵ء کے دَوران میں ہر اُٹھنے والے نے (خواہ وہ کسی طبقے اور سطح سے تعلق رکھتا ہو) ووٹروں کے سامنے نفاذِ اسلام کے وعدے کیے ہیں۔ اِن کی وجہ سے نئی اسمبلیوں میں اچھا خاصا عنصر سچے اسلامی جذبات کے ساتھ آیا ہے اور بقیہ لوگ بھی کم سے کم ظاہر کی حد تک اسلامیت کے حق میں ہیں (یا صریحاً مخالفِ دین نہیں ہیں) ان منتخب افراد میں اگر محبت و حکمت سے کام کیا جائے تو معتد بہ قوت غلبۂ اسلام کی کوششوں کے پلڑے میں اپنا وزن ڈال سکتی ہے۔

(باقی بر صفحہ ۵۱)

(بقیہ اشارات)

اِن اشارات سے مدّعا یہ عرض کرنا ہے کہ انتخابی نتائج صرف وہی نہیں ہیں جو "سیٹوں" کی شکل میں ملے ہیں، بلکہ ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہیں۔ انتخابی کام کی ان ساری افادیتوں کو جمع کر کے دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ نے محبانِ اسلام پر بڑا کرم فرمایا ہے۔

منذکرہ کامیابی جن ناسازگار حالات میں ہوئی ہے وہ ضرور پیشِ نظر رہنے چاہئیں خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ یہ انتخابات ایک طرح سے اضطراری نوعیت رکھتے ہیں۔ کئی برس تک گھٹن میں رہنے کے بعد جب انتخابی دروازہ یکایک کھلتا ہے تو اندر سے ریلے کا ریلا اس انداز سے نکلتا ہے کہ قوم کی سوچنے کی قوتیں زیادہ اچھی طرح کام نہیں کرتیں۔ اس کا اندازہ ہر انتخابی حلقے میں مقابلے کے لیے اُٹھنے والے طرح طرح کے اُمیدواروں کی کثرتِ تعداد سے کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ بار بار ایسے حالات پیدا ہوئے کہ گومگو کی حالت طاری ہو جاتی رہی۔ انتخابات ہوں گے یا اور آگے ٹلیں گے؟ جماعتی ہوں گے یا غیر جماعتی؟ بائیکاٹ کے نعروں کا کیا اثر پڑے گا؟ تخریبی عناصر کوئی خلل تو پیدا نہیں کریں گے؟ جمہوریت مارشل لاء کے ساتھ کیسے چلے گی؟ حکومت انتخابات کے کھیل کو خود تو خفیہ طور پر کنٹرول نہیں کرے گی؟ نظریات اور منشوروں کے بغیر آنے والے قسم قسم کے افراد مل جل کر چل بھی سکیں گے یا نہیں؟ دستور ۱۹۷۳ء کا کیا بنے گا؟ ترامیم جمہوری عمل میں قدم قدم پر رکاوٹ کا باعث تو نہیں بنیں گی؟ صدر اور وزیراعظم اور اسمبلی میں کیسے ہم آہنگی پیدا ہو سکے گی؟ ایم آر ڈی کے لیڈروں کی سیاست پولنگ کی تاریخ سر پر آ جانے کے بعد یکایک سارا تانا بانا اُدھیڑنے کا باعث تو نہیں بنے گی؟ آج ایک قاعدے کا نفاذ اور کل اُس کی منسوخی کا سلسلہ کوئی نامناسب شکل تو نہ پیدا کر دے گا؟ وغیرہ سوالات ایسے تھے جنھوں نے قوم کے ذہنی سکون کو تہ و بالا کر رکھا تھا۔

۳۔ انتخابی تیاری کے لیے نہ صرف مہلت کم تھی بلکہ غیر جماعتی فضا میں اُمیدواروں پر جلسے جلوسوں اور لاؤڈ اسپیکر کی پابندیاں اور پابند پریس کو ذریعہ اظہار بنانے کی مشکلات، ایسی بھاری تھیں کہ بڑے بڑے حلقوں میں ۸۰ ہزار یا ۱½ لاکھ ووٹروں کی تعداد سے رابطہ کرنا آسان نہ تھا۔

۳ — ہماری بڑی مشکل یہ تھی کہ ہمارے کارکن شروع سے جماعتی اور تنظیمی فضا میں کام کرنے کے عادی تھے، مگر اب اُن کے سر غیر منظم[1] صورت میں انتخابی مہم کی ذمہ داری آ پڑی تھی۔ اس کمزور پہلو ہی کی وجہ سے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا کہ انتخابی فیصلے براہ راست ایک مرکز سے کرنے کے بجائے زیادہ تر کام مقامی لوگوں پر چھوڑ دیا گیا۔ کہاں انتخابات میں حصہ لیا جائے اور کہاں نہیں، اور کون شخص کس جگہ سے کھڑا ہو اور کیسے لوگوں کا مقابلہ نہ کیا جائے اور کس طرح کے اُمیدواروں کی حمایت کی جائے، ان تمام اُمور کو عملاً مقامی اور علاقائی قوت کے حوالے کر دیا گیا۔ اِس صورتِ حالات میں ہمارے تصورات سے کہیں زیادہ تعداد[2] مختلف حلقوں سے کھڑی ہو گئی جب کہ مخالف و موافق حالات کا صحیح تجزیہ نہیں کیا گیا۔ اور کہیں حلقے نامناسب تھے اور کہیں افراد ناموزوں[3]۔ پھر دینی حلقوں اور محبِ اسلام شریف آدمیوں سے افہام و تفہیم کے دروازے (چند مثالوں کے سوا) قریب قریب بند رہے۔

اعلیٰ درجے کی منصوبہ بندی کیے بغیر جو معرکہ آرائی کی گئی اس میں جتنے نتائج نکلے ہیں وہ ہماری توقعات سے زیادہ ہی ہیں۔

[1] ساڑھے سات برس سے "کالعدم" چلی آنے والی جماعت کے سابق قائدین اور کارکنان آپس میں کتنے ہی رابطے کیوں نہ رکھیں، وہ مکمل طور پر فعّال جماعتی نظم کی برکات نہیں پا سکتے۔

[2] اصل میں اُمیدواروں کی اِسی تعداد کے ساتھ کامیاب ہونے والوں کا تناسب جب دیکھا اور دکھایا جاتا ہے تو ایم آر ڈی سے لے کر بی بی سی تک یہ تاثر سامنے آتا ہے کہ جماعت کو بڑی عظیم کامیابی ہوئی اور ان آوازوں سے متاثر ہو کر خود ہمارے اپنے حلقوں میں بھی بعض اصحاب اپنے چہروں پر احساسِ کمتری و ناکامی کی جھلک پیدا کر لیتے ہیں۔

[3] بعض حلقوں کے متعلق ہمارے اہم اصحاب پہلے سے جانتے تھے کہ یہاں کامیابی ممکن نہیں ہے مگر کالعدم جماعت کو مضبوط نظم کا وہ ہاتھ حاصل ہی نہ تھا کہ ان حلقوں میں جو گھوڑے دوڑ چکے تھے ان کو روکا جا سکتا۔

اگر حالات دوسرے ہوتے اور پوری جماعت منظم مشینری کے ساتھ میدان میں آتی اور کسی اچھے اور واضح منشور کی طرف قوم کو بلاتی تو معرکہ زیادہ پُرزور ہوتا۔ مگر اب تو بکھرے ہوئے افراد نے مقامی دوستوں کی مدد سے اپنی اپنی جگہ اقدام کیا ہے۔

۴ — پوری پوری جماعتی رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے ہماری انتخابی جدوجہد کی تکنیک، ہمارے دوستوں کا لٹریچر، ان کی تقریروں کا مواد اور انداز نیز ان کے موضوعات اور اصطلاحات ۵۱ — ۱۹۵۰ والا رنگ اپنے اندر لیے ہوئے تھے۔ گویا ہم وقت سے تیس پینتیس برس پیچھے کھڑے تھے۔

۵ — اگرچہ اس بات کی کوئی واضح علامت نہیں کہ مجموعی طور پر انتخابات ۸۵ کی باگ ڈور حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہو، مگر مقابلہ کرنے والے افراد کی طرف سے روپے سے ضمیروں کی خریداری اور برادریوں کی عصبیتوں سے ذہنوں کو مفلوج کرنے اور طرح طرح کی بدعنوانیوں سے انتخابات کو خراب کرنے کی افسوسناک کوششیں کی گئی ہیں (بعض حلقوں میں تو یہ غیر معمولی سطح تک پہنچیں) ان کے علی الرغم ہمارے دوستوں کی جتنی تعداد کامیاب ہو کے نکلی ہے وہ یہ اُمید دلاتی ہے کہ ٹھوس کام کر کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی حیلوں اور حربوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال حالات کے غیر موزوں ہوتے ہوئے، اعلیٰ درجے کی منصوبہ بندی کے بغیر جو معرکہ آرائی کی گئی اس سے جتنے نتائج نکلے ہیں۔ وہ ہماری توقعات سے کم نہیں، زیادہ ہی ہیں۔

اب ذرا کام کے ایک نازک گوشے کی طرف توجہ!

گذشتہ دور کے تمام انتخابات میں ہماری مضبوط روایت یہ رہی ہے کہ ایک ایک حلقے میں ہونے والے کام کا پورا پورا احتساب کر کے یہ جائزہ لیا جاتا رہا ہے کہ اصولی، قانونی اور اخلاقی لحاظ سے کیا کیا غلطیاں کی گئی ہیں۔ پھر ان غلطیوں کو متعلقہ کارکنوں کے سامنے لانے کے ساتھ ساتھ ان کے تدارک کا پورا پورا اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔ اب اگرچہ اُس درجہ کا منظم اور معیاری اہتمام شاید نہ ہو سکے۔ لیکن مقامی لوگوں کو بھی اور برتر حضرات کو بھی چھان کر دیکھ کر اچھی طرح معلوم کرنا چاہیے کہ ہم نے کہاں کہاں کیا کمزوریاں دکھائی ہیں۔ اس معاملے میں نہ کسی کا شخصی لحاظ کرنا چاہیے اور نہ معلومات

سامنے آنے پر لیپا پوتی یا ٹال مٹول سے کام لینا چاہیے۔ غلطی کسی فرد سے ہوئی ہو یا کسی ٹیم سے، اتنا ایمان ضرور زندہ ہونا چاہیے کہ خدا سے بے عجز و الحاح عفو طلب کی جائے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ۔

میں یہاں غلطیوں کی کوئی فہرست تو درج نہیں کر سکتا کہ اس غرض کے لیے نہ پورا پورا انتظام مجھے حاصل ہے اور نہ بہ حیثیت "اشارات نگار" ایسی تفصیلات پیش کرنا ضروری ہے۔ یہ جن کا کام ہے وہی کریں گے۔

مجھے تو صرف اتنا کہنا ہے کہ مختلف مقام اور حلقوں کے متعلق ہمارے اُمیدواروں یا ان کے کارکنوں کی کچھ نہ کچھ زیادتیوں اور کوتاہیوں کی اطلاع مجھے بھی ملتی رہی ہے۔ اس کے ساتھ زیادہ اذیت ناک شکایت یہ بھی سامنے آئی ہے کہ تنقید و احتساب کا شرعی فرض ادا کرنے والوں کو ناخوشگوار تجربات ہوئے ہیں۔ بعض صورتوں میں آگے سے منہ نوچنے والے جواب ملے ہیں اور بعض صورتوں میں کسی سنجیدہ معاملے کو تضحیک یا بے اعتنائی کا نشانہ بنا دیا گیا ہے۔ اس قسم کی جس کسی کو بھی شکایت ہوئی ہو، میں اپنے پورے ساتھیوں کی طرف سے اُس سے معافی مانگتا ہوں جس کسی کی طرف سے بھی ایسی اذیت رسانی ہوئی ہو، وہ بھی متعلقہ شخص یا اشخاص سے معذرت طلب کرے۔

تنقید و احتساب کرنے والا اپنے اندر کا کوئی فرد ہو یا باہر کا، وہ حقیقت کے اعتبار سے ہمارا محسن ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے شکر گذار ہوں۔ اور اس کے لیے بھلائی کی دعا کریں۔

اگر اس کی شکایت درست ہو تو اگر مگر کیے بغیر سر جھکا دیں اور اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔ اور جو خرابی سامنے آئے اس کا ازالہ کریں۔ اس معاملے میں خواہ مخواہ اپنی ناک اُونچی رکھنے کے لیے غلطی کی تاویلِ بے جا کر کے غلطی میں اور زیادہ اضافہ کرنا سخت نامناسب ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ یہ نئے حالات کی نئی ضرورت ہے، ایک ایسی بات ہے جسے دوسروں سے سُن کر ہمیشہ ہم نے اس کی تردید کی ہے۔ کیونکہ یہ جملہ ایک ایسی کلید ہے جس سے ماڈرن اور سیکولر طبقے کے لوگ دینی تقاضوں سے انحراف کے دروازے کھولتے ہیں، یا یہ کہنا کہ انتخابی کشمکش میں حریفوں کے سے حربے اختیار

کیے بغیر جیتنا ممکن نہیں۔ یہ دلیل اگر قبول کر لی جائے تو حریفوں کے پیچھے چل کر ہم نہ جانے کہاں جا پہنچیں گے۔ ہمارا اصول "اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ" ہی رہے گا۔ اسی طرح بعض افراد کی زبانوں سے ہم نے "الحرب خدعۃ" کا مشہور قولِ مسنون سُنا جس کا انطباق ناجائز شکل میں کیا گیا۔ اس ارشاد کو پہلے جن لوگوں نے غلط معنوں میں استعمال کیا ہے، ان کی تردید ہمارے لٹریچر میں موجود ہے۔ اب اگر خود اپنے ہی قائم کردہ نقطۂ نظر کے خلاف ہم اسے استعمال کریں تو یہ ہمارے زوال کی علامت ہوگی۔

اگر کسی کی شکایت نادرست ہو تو نرمی سے اس کے سامنے حقیقتِ حال کی وضاحت کی جائے اور اس کی غلط فہمی رفع کر دی جائے۔

بخلاف اس کے، اگر ہم لوگ احتساب کی زبانوں کو اپنے جوابی طرزِ عمل سے بند کر دیں تو ایک طرف تو ہم بندگانِ خدا کو ان کے شرعی فریضے سے روکیں گے جس کے نتیجے میں عام بددلی پیدا ہوگی۔ اور لوگوں میں یاس انگیز چہ میگوئیاں کرنے کا رجحان پیدا ہوگا، دوسری طرف ہم اپنے چہروں پر آنے والی خراشوں اور جبینوں کے داغوں کو دکھانے والے آئینوں کی مدد سے محروم ہو کر ایک غلطی سے دوسری غلطی کی طرف سفر کرتے چلے جائیں گے۔

کوئی نظمِ جماعت اقامتِ دین اور اتباعِ شریعت کا حق اس کے بغیر ادا نہیں کر سکتا کہ اس میں تنقید و احتساب کرنے کے لیے بے جھجک زبان کھولنے والے اور ان کی بات کو صبر و رواداری سے سننے والے موجود رہیں۔ تنقید کرنے والے بولیں نہیں تو ان میں خیر نہیں، سننے والے اگر سُنیں نہیں تو ان میں خیر نہیں۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے ۵۰ سالہ تشخص کے چہرے کو مسخ ہونے سے بچائیں۔ ہمیں اس خطرے کو محسوس کرنا چاہیے کہ ایک طرف ہمارے اندر کچھ عرصہ سے کچی بھرتی ہو رہی ہے اور دوسری طرف اعتقادی و اخلاقی لحاظ سے زخم خوردہ دوستوں کو ہم سابق معمول کے بخلاف اپنے آپ سے الگ نہیں کر سکتے۔ ایسی صورت میں مفسدات سے بھرے ہوئے ماحول کا دباؤ نہ صرف انتخابی میدان میں، بلکہ پوری زندگیوں میں ہمیں آہستہ آہستہ مغلوب کر رہا ہے۔ کتنی ہی بدعات، کتنے غلط رسم و رواج، کتنی ہی ناروا تقریبات، کتنے تہذیبِ نو کے فتنے، کتنی بے جا تفریحات ہم پر اثر انداز ہیں۔ تصویر کے

معاملے میں، موسیقی کے معاملے میں، پردے کے معاملے میں، اولادوں کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں، برادرانہ رابطوں اور باہمی ایثار کے معاملے میں، نظم کے معاملے میں، پابندیٔ وقت کے معاملے میں، اسراف و تبذیر کے معاملے میں غیر محسوس طریق سے جو پ پائی ہو رہی ہے۔ اس کا شعور و احساس اپنے ہی سابق لٹریچر کا بغور مطالعہ کرنے سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ انتخابات میں جو غلط چیزیں واقع ہوئی ہیں، اُن پر تنقید بھی سُنی جائے۔ ان کا احتساب خود بھی کیا جائے اور ان پر گرفت کر کے ان کے تدارک کی پوری کوشش بھی کی جائے۔

اب نئے حالات کے تحت جامع منصوبہ بندی کے ساتھ پُرزور کام کرنے کی ذمہ داری ہم پر عاید ہوتی ہے جس کے حسبِ ذیل تقاضے سامنے ہیں:۔

۱۔ پارلیمنٹری دائرے میں ضروری دفاتر کا قیام، نئے فرائض کے لیے منتخب نمائندوں کی تیاری و تربیت اور پارلیمانی حلقوں میں رابطے۔

۲۔ اپنے منتخب شدہ نمائندوں کے لیے ان کے اپنے حلقوں میں سرگرمی سے سوچے سمجھے خطوط پر کام کرنے کا منصوبہ۔

۳۔ پچھلی انتخابی مہم کے رابطوں کو جاری رکھنا اور متاثرین اور حامیوں کو قریب تر لانا۔

۴۔ آئندہ کے لیے مُلک میں حلقہ ہائے انتخاب کو پیش نظر رکھ کر ۵ سال کے لیے ایسے بھرپور دعوتی اور خدمتی کاموں کا نقشہ بنا کر چلنا اور اپنے ربط و اثر کو اتنا مضبوط کرنا کہ آئندہ کے لیے اتنی مستحکم بنیاد بن جائے کہ حتمی طور پر پہلے سے یہ اندازہ کیا جا سکے کہ یہاں ہم دولت، برادری اور ہر قسم کی بدعنوانیوں کا مقابلہ کر کے بھی جیت سکیں گے۔

سو تحریکِ غلبۂ اسلام کے سپاہیوں سے میں دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ کمر ہمت باندھ کر ایک بار مجاہدوں کی طرح نکل کھڑے ہوں اور تہیہ کر لیں کہ اگلے پانچ سال کے عرصے میں انہیں حالات کو اپنے حسبِ منشا زیر و زبر کر دینا ہے۔

خدا مجھے اور آپ کو اپنی رہنمائی اور تائید سے نوازے! آمین۔